بلوچستان کا مسئلہ اور اُردو افسانہ

صدف مشتاق، پی ایچ۔ ڈی اسکالر، جی سی یونیورسٹی، فیصل آباد

Abstract

The Afsanas written in Blochistan attached with the Local land. Local problems were strongly presented in modern ways in the Afsanas.

بلوچ قوم کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ یہ سامی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ جسٹس میر خدا بخش بجرانی مری کی انگریزی تصنیف ’’Search Light on Baluches & Baluchistan‘‘ کا اُردو ترجمہ پروفیسر سعید احمد رفیق نے کیا جس کی معاونت خود مصنف نے کی اس کتاب کا ایک پیرا گراف ملاحظہ کیجیے:

> ’’زمانہ ماقبل تاریخ سے موجودہ دور تک انسانی نسلیں آپس میں خلط ملط ہوتی رہی ہیں اس واسطے وثوق سے یہ کہنا کہ بلوچ، سامی، جامی یا آرین میں سے کسی نسلِ انسانی سے تعلق رکھتے ہیں اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ بلوچی زبان اور تاریخ میں مستند کتب اور تاریخی مواد کی قلت کی بنا پر یہ کام اور بھی زیادہ مشکل ہو گیا ہے۔‘‘[۱]

پاکستان کے قیام اور تعمیر و ترقی میں بلوچوں کا حصہ کسی بھی علاقے سے کم نہیں ہے اور نہ ہی وہ کسی طور کم محبتِ وطن ہیں لیکن پچھلی تقریباً دو دہائی سے عالمی سازشوں، غیر ملکی ریشہ دوانیوں، ملکی ایجنسیوں اور حکمرانوں کی ناعاقبت اندیشیوں، ذاتی مفادات اور سیاسی و معاشی فائدوں کے لیے بلوچستان کے حالات خراب کیے گئے۔ وہاں بدامنی اور عدمِ تحفظ کا مسئلہ پیدا کیا گیا۔ نسلی، مذہبی اور لسانی نفرتوں کو پروان چڑھایا گیا اور مختلف گروہوں کو آپس میں لڑایا گیا۔ بلوچستان کے وسائل کا ناجائز استعمال کیا گیا اور بلوچوں کو اُن کے حقوق اور وسائل سے محروم کیا گیا۔ اُن کے جائز مطالبات کو غداری اور مُلک دُشمنی کا نام دیا گیا۔ اُن کے راہنماؤں کا قتل، عام نوجوانوں کے اغوا، تشدد اور پھر مسخ شدہ لاشیں وہاں کا معمول بن گیا۔ نتیجتاً بیرونی طاقتوں کو یہاں مداخلت کرنے اور محروم افراد کی محرومیوں سے فائدہ اُٹھا کر اُنھیں اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے کے مواقع دستیاب کیے گئے۔ محرومیوں کی نفرت نے صوبائی خودمختاری کے مطالبہ کو مکمل آزادی کی مانگ میں بدل دیا، اب سکیورٹی فورسز اور ناراض بلوچ گروہوں میں ایک ایسی لڑائی جاری ہے جس نے عوام کے لیے زندگی مشکل بنا دی ہے۔

ہمارا موضوع یہ ہے کہ آج کے ان حالات میں اُردو افسانہ بلوچستان کے ان مسائل کو کس طرح پیش کر رہا ہے اور کس حد تک سیاسی شعور کا اظہار اس حوالے سے اُردو افسانہ نگاروں کے ہاں موجود ہے۔

اُردو کے معروف اور مستند افسانہ نگاروں کے ہاں تقریباً اس مضمون پر خاموشی ہی ملتی ہے۔ اِکا دُکا افسانے کے سوا بلوچستان کی سرزمین اور اُس کے مسائل، اُردو افسانہ نگاروں کے ہاں نظر نہیں آتے البتہ خود اس زمین سے تعلق رکھنے والے کئی افسانہ نگار اپنی زمین کا نوحہ ضرور لکھ رہے ہیں۔ شاہ محمد مری لکھتے ہیں:

> ''ہمارا پورا تحریری ادب سنسروں کے حوالے ہو گیا۔ مارشل لاء کا سنسر، روایت کا سنسر، مُلا کا سنسر، سردار کا سنسر۔۔۔ نحیف افسانہ سکرات میں چلا گیا اور پھر آج کا دور ایک مکمل انارکی کا دور۔۔۔ الغرض ہمارے سماج کو سانس لینے کا موقع ہی نہ مِلا۔''[۲]

بلوچستان میں مقامی زبانیں بولی جاتی تھیں لیکن سکولوں، کالجوں، دینی مدرسوں میں اُردو زبان مروّج تھی، جو یہاں مختلف زبانیں بولنے والوں کے درمیان رابطے کی زبان بھی تھی۔ اُردو ایک ثروت مند ادبی ورثے کی حامِل ہے۔ بلوچستان میں بھی اُردو کی مختلف اصناف میں ادب تخلیق ہوتا رہا

مسز مبارکہ حمید نے اپنے تحقیقی مقالے ''بلوچستان میں اُردو افسانے کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ'' میں لکھا ہے:

> ''یہاں ابتداء میں صرف اُردو میں افسانوں کی طرف اتنی زیادہ توجہ نہیں ملتی اور اگر لکھے بھی گئے تو وہ فنی اور تکنیکی لحاظ سے کمزور افسانے تھے لیکن بعد میں تہذیبی ترقی اور علمی و ادبی سرگرمیوں کے سبب اس فن کی طرف خصوصی توجہ ہوئی اس میں سب سے پہلے جو نام اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ وہ یوسف عزیز مگسی کا ہے۔''[۳]

یوسف عزیز مگسی کی تحریروں میں آزادی کی لگن اور غلامی سے نفرت کا اظہار ملتا ہے۔ یہی موضوع ان کے ایک افسانے ''تکمیلِ انسانیت'' کا ہے جس میں افسانے کا ہیرو عزیز احمد تحریکِ آزدی کے حق میں ایک مضمون لکھنے کے جرم میں قید کر دیا جاتا ہے لیکن اس دوران بھی وہ قربِ الٰہی اور اپنے خلوص و ایثار کی وجہ سے تکمیلِ انسانیت کے مقام پر متمکن ہو جاتا ہے۔

ناصر بلوچستانی کا ایک افسانہ ''عروسِ عجم'' کے عنوان سے الحنیف جیکب آباد سالنامہ فروری ۱۹۳۷ء میں چھپا۔ اس افسانے میں حب الوطنی بلوچ عورتوں کی دلیری بلوچ روایات کے علاوہ رومانویت اور حقیقت نگاری کے عناصر موجود ہیں۔

بیگم خورشید مرزا کا نام بھی بلوچستان میں اُردو افسانے میں اہم ہے۔ انھوں نے کم لکھا زیادہ تر عورتوں کے مسائل کی نشاندہی کی عورت کی وفاشعاری، ایثار، شوہر سے محبت، بدلے میں ملنے والی محرومیاں اور جذباتی و نفسیاتی اُلجھنوں پر قلم اُٹھایا۔

عبدالرحمٰن غور ایک اچھے ادیب اور افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانوں میں ہمیں بلوچستان کے زمینی رنگ، فضا، ماحول اور تہذیبی و روایتی کلچر نمایاں نظر آتا ہے۔ وہ سیاسی و سماجی مسائل پر بھی قلم اُٹھاتے ہیں۔ پیسوں کے عوض کم عمر لڑکیوں کی عمر رسیدہ مردوں سے شادیاں اُس دور کے بیشتر افسانہ نگاروں نے اس مذموم روایت پر مذمتی انداز میں بہت لکھا۔ عبدالرحمان غور کے ہاں بھی عورتوں کے مسائل کو ہمدردی اور دُکھ کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

افسانے کی فنی دروبست، زمان و مکان کی بندش آغاز و انجام میں ربط و ضبط، پلاٹ کی بنت اور واقعے کی دلچسپی قاری کو باندھے رکھتی ہے، پھر بلوچستان کے رسوم و روایات، مناظر، تمدن کی عکاسی کرتے ہوئے مقامی الفاظ کا استعمال کہانی کو زیادہ حقیقی اور موضوع و منظر کے زیادہ قریب کر دیتا ہے۔

یکم اگست ۱۹۳۶ء میں والبندیں ضلع چاغی میں پیدا ہونے والے طاہر محمد خان پیشے کے لحاظ سے قانون دان ہیں۔ اُنھوں نے اعلیٰ تعلیم پائی اور سیاسی، رفاعی اور ادبی میدانوں میں نہایت بھرپور زندگی گزاری۔

عنایت اللہ خان جو ہفت روزہ نشتر کوئٹہ اور ماہنامہ نوکیں دور (کوئٹہ) کے ایڈیٹر رہیں، لکھتے ہیں:

> ''طاہر محمد خان طبعاً افسانہ نگار ہیں ان کے افسانے عمیق سماجی شعور سے مملو ہیں ان کے افسانوں کی تعداد بے شمار ہے لیکن اُنھوں نے کبھی ان کو محفوظ کرنے کی کوشش نہیں گی۔''[۴]

شاید اسی وجہ سے اُن کا صرف ایک مجموعہ شائع ہو سکا۔ ''زود پشیمان'' جو ۲۰۰۴ء میں چھپا، جس میں اُنیس کہانیاں شامل ہیں۔ بلوچستان یونیورسٹی کوئٹہ کے پروفیسر ڈاکٹر فاروق احمد لکھتے ہیں:

> ''بلوچستان کے قبائلی نظام اور سماجی زندگی کا اتنا موثر اور درد بھرا اظہار ہمیں کہیں اور نہیں مِل سکتا۔ بلوچستان کی سچی اور نکھری ہوئی دستاویز پڑھنا ہو تو ان افسانوں کو پڑھ لیجیے یہ ایک مہذب انسان کی آواز ہے۔ یہ چشم خوں بستہ سے ٹپکا ہوا لہو ہے جو کبھی رائیگاں نہیں جاتا۔''[۵]

ان کا ہر افسانہ بلوچستان سے متعلق کسی تلخ حقیقت کو سامنے لاتا ہے، لیکن واقعات کی ندرت اور اندازِ بیان کی دلچسپی تلخ حقائق کو گوارا بنا دیتی ہے۔ مثلاً افسانہ ''زود پشیمان'' کا تھیم ہلا دینے والا ہے۔ بلوچستان میں موجود ایک عجیب روایت کا ہمیں یہاں علم ہوتا ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار ٹکڑی ایک معزز قبائلی شخص ہے۔ اس نے اپنی بیٹی گل پری کی شادی اپنے بھتیجے سومر سے کرادی۔ شادی کی پہلی رات ہی سومر وگل پری کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے کیونکہ وہاں کی روایت کے مطابق لڑکی اپنی بکارت کا ثبوت دینے سے قاصر رہی تھی۔ پورے خاندان میں کہرام مچ جاتا ہے۔ مجرم کی تلاش شروع ہوتی ہے ''جولاں'' جو ٹکڑی کے قبیلے کا آدمی تھا۔ اُس کے بیٹے صلائی پر گناہ کا الزام آتا ہے، جرگے کے فیصلے کے مطابق صلائی اور گل پری دونوں کو مار دیا جاتا ہے۔ علاقے کے رواج اور روایت تو پورے ہو گئے لیکن افسانہ نگار واقعات کی خارجی سطح کے اندر جھانک کر باطنی سطح کو بھی دیکھتا ہے۔ سگی بیٹی کو قتل کرنے والا باپ بظاہر اپنی غیرت مندی اور قبائلی روایات کی پاسداری پر فخر کا اظہار کرتا ہے لیکن ایک روز اُس کے اندر کا انسان یعنی بیٹی کا باپ بول پڑتا ہے، کہتا ہے:

> ''وکیل صاحب جب میں نے گل پری کو ذبح کیا تو اس کے خون کی دھار میرے ہاتھ پر گری، جس نے میرے ہاتھ کو جلا دیا جس کی جلن آج بھی محسوس کرتا ہوں گل پری ہر رات میرے خواب میں آتی ہے اور بے بسی میں اب بھی وہی آواز دیتی ہے، ہائے ماں، یہ کہہ کر ٹکری دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔''[۶]

اس مجموعے میں شامل ایک اور افسانہ ''پانی کا جبر'' بلوچستان کے خانہ بدوشوں کی سخت کوش زندگی اور وہاں سہولیات کی کمیابی کو واضح کرتا ہے۔

> ''ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ آج بھی انسان اس قدر بے بس ہو سکتا ہے۔۔۔ ہم رضائی کے گدان پر موت کو منڈلاتے دیکھ رہے تھے۔۔۔ میں سوچ رہا تھا کہ صبح کی پہلی خبر رضائی کی بیوی کی موت ہو گی اس کی موت سے زیادہ مجھے اس کی تجہیز و تکفین کی فکر رہی۔ کیونکہ اس کھلے صحرا میں کوئی ایسا انتظام

> نہیں تھا پھر مجھے خیال آیا کہ بیڈشیٹوں سے یہ کام لیا جا سکتا ہے لیکن شریعت کا خیال آیا کہ ہم اتنے مہینوں سے ان پر سو رہے ہیں لازماً یہ نجس ہوئے ہوں گے۔ صاف پانی پینے کو نہیں بھلا بیڈشیٹوں کو کیسے دھویا جائے اور میّت کو کیسے غسل دیا جائے گا۔''[۷]

لیکن صبح معلوم ہوا کہ رات کو بچہ پیدا ہو گیا تھا اور دونوں زچہ بچہ خیریت سے ہیں۔ ان پہاڑوں اور وادیوں کی سخت کوش زندگیوں میں خدا کی مدد ہی آخری وسیلہ ہوتی ہے بہرحال یہ افسانہ وحدتِ تاثر، پلاٹ کی تنظیم اور ضبط و ربط کے باعث قاری کے پورے حواسوں پر چھا جاتا ہے۔ اسے اُردو کے اچھے افسانوں میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ ان کی کہانیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے وحید زہیر کہتے ہیں:

> ''طاہر محمد خان کے افسانے بلوچستان کی حقیقی کہانیاں ہیں ان کہانیوں میں ہماری سائیکی، سماجی اور ثقافتی ماحول، تاریخی حقائق کے ساتھ کرداروں کو برتا گیا ہے جن کو ہم بلوچستان کی نمائندہ کہانیاں کہہ سکتے ہیں۔''[۸]

ان کہانیوں میں بلوچستان میں معدنیات سے بھرے پہاڑوں اور صحراؤں، خشک سالیوں، سیلابوں، قبیلوں اور خانہ بدوشوں کے طرزِ حیات، عورتوں کی ستم رسیدگیوں، رسوم و روایات اور جرگوں کی ناقابلِ فہم اقدار، مقامی سیاست اور ملکی حالات کے اثرات غرضیکہ بلوچستان کے جغرافیہ، معاشرہ اور سیاست سبھی کچھ موجود ہے۔

ڈاکٹر فردوس انور قاضی بھی بلوچستان کی ایک اہم افسانہ نگار ہیں۔ اُن کی وجہِ شہرت تو اُن کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ''اُردو افسانہ نگاری کے رجحانات'' ہے لیکن وہ ایک اچھی افسانہ نگار بھی ہیں۔ اُنھوں نے تکنیک و ہیئت کے کئی تجربے کیے مثلاً زمان و مکاں کی قید سے آزاد خیالات کے گرد کہانی کو بنا اور اس کا نام خیالیہ رکھا اس میں خیال کی رو اور تلازمۂ خیال جیسی اصطلاحوں سے ہٹ کر ایک مجرد سوچ یا خیال کو کہانی کی تجسیم میں پیش کیا ہے جب کہ تلازمہ خیال یا کہانی کے اندر سے سوچ کا بھٹکنا یا کرداروں کا زمان و مکاں سے پرواز تخیل کر جانا یا سوچ کی کسی نئی رو کا داخل ہو جانا وغیرہ ہوتا ہے ان کے ہاں خیال پہلے موجود ہوتا ہے۔ اُسے کہانی کی شکل میں ڈھالا جاتا ہے۔ یہ تمثیل سے بھی یوں فرق ہے

جمیل زبیری نے بھی بلوچستان کے پس منظر میں کہانیاں لکھی ہیں۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''زرد پتے'' کے نام سے شائع ہوا دوسرے مجموعے کا نام ''لمحوں کی دہلیز'' ہے۔ اس مجموعے کی بیشتر کہانیاں، بلوچ رسم و رواج، اُس معاشرے کی قدیم روایات وہاں کا لینڈ اسکیپ اور معاشرتی و سیاسی ماحول کو پیش کرتی ہیں چونکہ یہ ایک نیم خواندہ اور نیم خانہ بدوش معاشرہ ہے اس لیے اس کے مسائل بھی اپنی ہی نوعیت کے ہیں۔

افضل مراد بلوچستان کے ایک اہم افسانہ نگار ہیں۔ انھوں نے بلوچستان کی تہذیب و ثقافت، جغرافیائی ماحول اور مخصوص معاشرتی و سیاسی فضا کو پیش کیا ہے۔ اس خطے میں جاری سختیوں، پسماندگیوں اور مجبوریوں کی عکاسی خوب کی ہے۔ خصوصاً عورت کے ساتھ روا رکھے گئے ترجیحی سلوک اور اُس کی حق تلفی کو کئی افسانوں کا موضوع بنایا ہے کیونکہ اُس معاشرے میں عورت اور مرد کے لیے الگ الگ قوانین ہیں۔ عورت کو اپنی مرضی اور آزادی سے جینے کا حق حاصل نہیں ہے۔ مصنف نے اس ناانصافی پر دلسوزی سے لکھا ہے۔

شکیل عدنان نے بھی اس معاشرے میں جاری معاشرتی و معاشی ناہمواریوں کو اپنا موضوع بنایا اُن کے افسانے اصلاحی رجحان کے غماز ہیں۔ وحید زہیر بنیادی طور پر براہوی زبان کے کہانی کار ہیں لیکن اپنے کئی براہوی افسانوں کے تراجم اُنھوں نے خود اُردو میں کیے۔ مثلاً ’’اووررائیٹنگ‘‘، ’’نعیم چارٹ ہاؤس‘‘ اور ’’ڈسٹرب لائسنس‘‘ وغیرہ وہ معاشرتی، سرکاری و دفتری مسائل کو پیش کرتے ہوئے مقامی معاشرے کی حقیقت نگاری کے اسلوب میں ترجمانی کرتے ہیں۔

عارف ضیاء بھی براہوی میں لکھتے ہیں لیکن اُنھوں نے اُردو میں بھی افسانے تحریر کیے جو اُن کے مجموعے ’’سیپ کے اندر موتی‘‘ کے نام سے طبع ہوئے ان افسانوں میں مقامی، معاشرتی مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے وہ انسانوں کے درمیان محبت اور دوستی کی خواہش رکھتے ہیں۔ امن اور بھائی چارے کی فضا کے مفقود ہو جانے پر تاسف کا احساس گہرا ہے۔

فاروق سرور کا تعلق بھی بلوچستان سے ہے۔ اُن کے تین مجموعے پشتو زبان میں چھپے ایک مجموعہ پشتو افسانوں کے اُردو تراجم کی شکل میں ’’ندی کی پیاس‘‘ کے عنوان سے چھپا اُن کے ہاں علامتی رنگ غالب ہے۔ عہد کی نارسائی، ماحول کا جبر اور اندر کا خوف ان کے افسانوں میں کئی علامتوں کو ساخت کرتا ہے۔ معاشرہ ترقی کی بجائے تنزلی کی سمت گامزن ہے جو اخلاقی و تمدنی اقدار اور معیارات ایک مثبت سطح قائم کیے ہوئے تھے وہ مضبوط ہونے کی بجائے اب کمزور ہو رہے ہیں۔ اُن کے افسانہ ’’بھیڑیا‘‘ کا ایک اقتباس دیکھیے:

> ’’میں جب اردگرد دیکھتا ہوں تو حیران رہ جاتا ہوں میرے چاروں طرف بے شمار درخت ہیں ہر درخت میں کسی نہ کسی شخص نے پناہ لے رکھی ہے، اور نیچے اُس کا بھیڑیا کھڑا غرا رہا ہے۔‘‘[۹]

محسن سلطان کے افسانوں کے مجموعے ’’خود سے چھپا اُداس آدمی‘‘ کے افسانے علامتی و استعاراتی رنگ کے حامل ہیں جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے کہ نارسائی اور عہد کی جبریت آج کے انسان کا المیہ ہے یہ المیہ ذاتی سطح سے معاشرتی اور سیاسی سطحوں تک کو محیط ہے۔ اُنھوں نے طنز کے اسلوب میں معاشرے کے انھی تضادات کو اُبھارا ہے۔

حسن جاوید شاعر اور افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانوں میں بھی علامتی انداز غالب ہے۔ فرد کی توڑ پھوڑ بگڑتے ہوئے چہرے معاشرتی تمدنی انتشار اور انسان کی تنہائی اور افسردگی اُن کے افسانوں کو اسّی کی دہائی کے مخصوص اسلوب کا حامل بنا دیتے ہیں۔ بلوچستان کے افسانہ نگاروں میں آغا گل کا نام اس لیے بھی نمایاں ہے کہ اُنھوں نے اُردو زبان کو ہی اپنا وسیلۂ اظہار بنایا، تواتر سے لکھا اور اچھا لکھا اُن کے افسانے کئی دہائیوں سے معیاری اُردو جرائد میں چھپتے رہے ہیں اور کئی مجموعوں میں طبع ہو چکے ہیں۔ سہراب اسلم لکھتے ہیں:

> ’’بڑا ادب کبھی خلا میں تخلیق نہیں ہوتا۔ وہ ایک خاص دھرتی اور معاشرت کی کوکھ سے کونپل کی مانند پھوٹتا ہے۔ تناور پودے میں تبدیل ہوتا ہے اور پھر اس کی شاخوں پر جو پھول کھلتے ہیں وہ بلاامتیاز مذہب وملت علاقہ اور زبان سب انسانوں کی اپنی مہکار سے معطر کرتے ہیں۔‘‘[۱۰]

افسانہ ’’اُستاد مہر‘‘ میں سے یہ پیرا دیکھیے:

> ’’۱۹۷۲ء میں بلوچستان کو صوبے کا درجہ دیا گیا قبل ازیں بلوچستان کہنا اس علاقے کو قابلِ دست اندازیِ پولیس ہوا کرتا تھا۔ اس علاقے کو کوئٹہ، قلات ڈویژن کہا جاتا تھا۔ صوبہ بلوچستان بننے سے

> یو پی کلچر کم زور پڑ گیا۔ بلوچستانیوں کو بھی ملازمتیں ملنے لگیں۔ ورنہ ان کے حصے میں چپڑاسی، چوکی دار، مالی یا اگر قسمت یاوری کرے تو ڈرائیور کی ملازمت آیا کرتی۔ مشاعروں کی وبا بھی کم ہوگئی۔''[۱۱]

ان افسانوں میں نہ صرف بلوچستان کی تاریخ کی بازخوانی ملتی ہے بلکہ اس سرزمین کے جغرافیے، موسمی حالات، زمینی کوائف سے آگاہی بھی حاصل ہوتی ہے۔ یہاں کے باشندوں کے اقدار وروایات، مزاج اور عادات و اطوار سے ہی واقفیت نہیں ملتی، بلکہ اُن کی سوچ اور نظریات بھی واضح ہو جاتے ہیں، پاکستان بننے کے بعد یہ خطہ غیر مطمئن ہونے لگا۔ اُن کی شکایات اور گلے بہت تھے جنھیں شاید کسی نے سننے اور اُن پر ہمدردانہ غور کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی اسی لیے مختلف صوبوں کے درمیان خلیج بڑھتی گئی بلکہ نسلی اور لسانی شناخت کی خواہش، منافرتوں اور تفاوت میں تبدیل ہوگئی۔ خصوصاً پنجاب پر الزامات اور اس سے مغائرت بڑھتی چلی گئی، دیکھیے:

> ''براہوی کبھی زرخیز زمینوں پر حملہ آور نہ ہوئے کبھی دریا؟ں کی سونا اُگلتی زمینوں کے خواب نہ دیکھے کیا قناعت ہے ہم میں! کیا توکل ہے، کیا درویشی ہے؟ لیکن قابیل کہ بڑا بھائی ہے۔ گندم اور کپاس کا مالک ہے اسے تو ہمارا محافظ ہونا چاہیے۔ وہ اپنے ہی چھوٹے بھائی کو فتح کرنے نکل کھڑا ہوا ہے۔''[۱۲]

> ''آئے دن لوگ غائب ہو رہے تھے ان کے ورثا احتجاج کرتے دھرنے دیتے تو پولیس ان پر ٹوٹ پڑتی گھروں میں رونے دھونے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا مگر پولیس کو ان آدم خور عقابوں سے بھلا کیا ہمدردی؟ وہ کیوں گولڈن ایگل کو تحفظ دیئے جا رہے تھے۔۔۔''[۱۳]

افسانہ ''ایڈکولیم'' پولیس کے منفی کردار عقوبت خانوں کی ایذا رسانی، سیاسی الزامات پر معصوم شہریوں کی پرتشدد ہلاکتیں بدلے میں عوام میں بڑھتے ہوئے غم و غصے اور احتجاج کو پیش کرتا ہے۔ اس افسانے میں بھی تاریخی اور اساطیری اسلوب کو موضوع کی وضاحت کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ اس قدیم سیاسی اصطلاح کو بلوچستان کے تناظر میں بخوبی استعمال کیا گیا ہے جس سے افسانہ اپنی فنی معنویت میں کئی درجے بلند ہو گیا ہے۔

اسی موضوع کا حامِل افسانہ ''بوئے خونِ دِل ریش'' ہے۔ اس افسانے میں ایک جاگیردار ہے جو دراصل اس گلوبل ولیج کے استحصال کنندہ کی علامت ہے۔

افسانہ ''بازگیر'' اسی گلوبل ولیج کی کہانی ہے۔ جہاں استحصالی قوتیں غریب افراد یا اقوام کے وسائل لوٹنے کو ایک جال پھیلاتی ہیں جو مقامی، قومی اور بین الاقوامی سطح پر چال بازیوں اور سازشوں کا تانا بانا بنتی ہیں۔ اس افسانے میں بلوچستان کے پس منظر میں عوام کے وسائل لوٹنے کی رُوداد شکاری، شکار اور جال کی علامتوں سے پیش کی گئی ہے۔ اس دیہی منظرنامے میں استحصالی قوتوں کا بنیادی شکار باز ہے، جسے بچانے کو ''کمال چاچا'' ایک مزاحمتی کردار کے طور پر سامنے آتا ہے۔ یہ اقتباس دیکھیے:

> ''اس دھرتی کے غیور فرزندو! زمین اور مٹی ماں سے زیادہ مقدس ہوتی ہے۔ اپنی عظیم ماں کا دامن داغدار ہونے سے بچا؟ اِس کے تقدس پر آنچ مت آنے دو۔ ان خودغرض استحصالیوں کے سامنے آہنی چٹان کی طرف ڈٹ جا؟۔۔۔ان کا راستہ روکو۔۔۔ ورنہ ہاتھ ملتے رہ جاگے۔''[۱۴]

''ملنگ باچا'' میں بھی مرکزی کردار ظلم و ستم سہتے سہتے آخرکار استحصالی قوتوں کے خلاف مزاحمت کی علامت بن کر

اُبھرتا ہے۔ مصنف اپنی سرزمین سے پوری طرح وابستہ ہے اسی زمین کا دُکھ ''آخری آنسو'' میں بھی نظر آتا ہے۔ غرضیکہ بلوچستان کے سارے دُکھ سکھ، گہرے، شوخ رنگ، بلوچستان کی روائتیں اور رسوم اور ثروت مند زمین کی بھوک اور یہ بھوک بانٹنے والے عناصر یہاں کا امن وسکون چھیننے والے اور نفاق بونے والے ان دیکھے ہاتھ سبھی کو گہرے سیاسی شعور کے ساتھ مصنف نے پیش کیا ہے۔

علاوہ ازیں آشوبِ عہد اور عدم تحفظ کا احساس جو بلوچستان اور باقی ملک میں موجود ہے۔ اُس کا عکس بھی ان افسانوں میں دکھائی دے جاتا ہے۔ مثلاً شاہین روحی بخاری کا افسانہ ''خدا کی آنکھیں'' جس میں جنگ سے نفرت اور امن کی خواہش ملتی ہے۔ رقیہ آرزو کا افسانہ ''وطن کی مٹی'' حب الوطنی کے جذبے کو پیش کرتا ہے۔ لیکن بیشتر خواتین نے عورتوں کے مسائل کو ہی مرکز توجہ بنایا۔ اُن پر مردوں کی اجارہ داری اور بنیادی انسانی حقوق سے محرومی کے کرب کو بیان کیا ہے۔ معاشی و معاشرتی ناہمواریوں، غربت وافلاس اور عورتوں کی بے کس زندگی کو بیانیہ حقیقت نگاری میں سمو دیا ہے۔

جدید عہد میں اُجالا مینگل، اُجالا تبسم، جویریہ حق وغیرہ بلوچستان کے انھی پرانے مسائل اور فرسودہ روایات کو نئے انداز سے لکھ رہی ہیں۔

اُجالا مینگل کا ایک افسانہ ''بابا ہم کب پہنچیں گے'' روشنائی کے اپریل تا جون کے شمارہ ۲۰۰۶ء [ل] میں چھپا تھا، جس میں ایک جلے ہوئے بچے کو اُس کا باپ کسی ہسپتال میں پہنچانے کی کوشش کرتا ہے لیکن ٹوٹی پھوٹی سڑکوں اور سست رو پرانی بس دُور دراز کے اس ہسپتال تک پہنچنے ہی نہیں دیتیں، بچہ رستے میں ہی دم توڑ دیتا ہے۔ وہ بار بار اپنے باپ سے ایک ہی سوال پوچھتا ہے ''بابا ہم کب پہنچیں گے۔''

باپ اُسے جھوٹی تسلیاں دیتا ہے لیکن جانتا ہے کہ اس علاقے کی پسماندگی اور بنیادی انسانی سہولیات کی کمی کی وجہ سے بچہ جانبر نہ ہو سکے گا۔ افسانہ انتہائی کرب انگیز تاثر کے ساتھ اختتام پذیر ہوتا ہے۔ قاری تا دیر اُس کرب کے دبا؟ سے باہر نہیں نکل سکتا ہے۔ اسلوب کا رچا؟ اور مقامی الفاظ کا استعمال احساس کی شدت کو بڑھا دیتے ہیں۔ بچے کا جملہ محرومیوں کا وہ تازیانہ ہے جو اس سرزمین کا استعارہ بن جاتا ہے کہ آخر یہ خطہ کب اکیسویں صدی کی سہولیات حاصل کر سکے گا کب دیگر علاقوں کا ہم رکاب ہو پائے گا کب ترقی کی اُس سطح پر پہنچے گا جہاں اُسے پہنچنا چاہیے تھا۔ یہی وہ بنیادی دُکھ یا مسئلہ ہے جس کا احساس بڑھتے بڑھتے اب ایک گمبھیر سیاسی انتشار اور تنازعے میں تبدیل ہو چکا ہے۔

محمد حمید شاہد کا افسانہ ''برشور'' بلوچستان میں خشک سالی کے عذاب کو پیش کرتا ہے، جہاں لاکھوں روپے کمانے والے امدادی ٹیموں سے بھیک مانگنے پر مجبور ہیں۔ پورا علاقہ صحرا میں تبدیل ہو چکا ہے باغات بھسم ہو گئے ہیں اور وہ شخص جس نے بیٹی کے نام پر مسجد بنائی تھی وہ تاج محمد ترین تھا جس نے بے تحاشا قرضہ اُٹھا کر بار بار کنویں کھدوائے تھے۔ زمین کا سینہ پانی سے بالکل خالی ہو چکا تھا کھیت تو سیراب نہ ہوئے اس خرچے کے عوض یہ ساری زمین، قلعہ اور دیگر اسباب دے کر بھی قرض نہ چکا سکا اور آخر بیٹی بھی اسی کی نذر کرنا پڑی۔

> ''اس سے دگنی عمر والے تسبیح اُٹھائے دودھ جیسی سفید ریش والے معزز نظر آنے والے شخص نے اس کے کندھے پر اپنی تسبیح والا ہاتھ رکھا اور کہا۔

> ''ترین کیوں تماشا بناتے ہو تم نے پچھلے سات سالوں میں جتنی پے منٹ مانگی میں نے دی۔۔۔ دیکھو میں نے تمہاری بیٹی سے اتنے شریف لوگوں کے سامنے نکاح کیا ہے۔۔۔ اب باقی قرض میں خدا رسول کے نام پر تمہیں معاف کرتا ہوں۔
>
> ترین چپ ہونے کی بجائے اور شدت سے چیخا۔
>
> خدا رسول کے نام پر۔۔۔؟''[۱۵]

آخر وہ مسجد کے ستون سے لپٹ کر دھاڑیں مارتے کہتے چلا گیا۔

''کاش میں تمہیں بیچ سکتا۔''

حساس فوجی دستے پر لق و دق صحرا میں گوریلا حملہ ہوا، حملہ آوروں کی تلاش میں ایک ٹیم بھیجی گئی جسے راستوں کی جانکاری دینے کے لیے بچل کی خدمات حاصل کی گئیں یہ شخص عجب شخصیت کا مالک تھا۔ ایک ماہر کھوجی جو راستے کی گرد سونگھ کر حالات کا پتہ بتا سکتا تھا جو دنوں کچھ کھائے پیئے بغیر صحراؤں کی ریت اور نوکیلے پتھروں پر سفر کر سکتا تھا، جو کہتا ہے:

> ''سائیں! ہم جب چلتے ہیں تو اپنی رُوح کو جسم سے الگ کر لیتے ہیں اس سے جسم بالکل ہلکا سا ہو جاتا ہے۔''[۱۶]

یہ ایک صحرائی سفر تھا جس کے دوران واحد متکلم کو عجب تجربات ہوتے ہیں۔ ایسی پُر مشقت زندگی، بھوک پیاس صحرا کی گرمی پتھروں کی ساخت اور پھر ان کو سر کرنے والے یہ باشندے جن کے عزم اور کردار پہاڑوں جیسے اٹل اور مضبوط ہیں، جنھیں محرومیوں نے تشدد کی راہ پر ڈال دیا ہے۔ افسانے کا انجام بھی اسی نظریے کو پیش کرتا ہے جب دونوں مجرم مِل گئے تو ٹیم کا ایک رُکن منصور اُنھیں گولی مارنا چاہتا ہے لیکن راشد اُسے منع کرتا ہے تو وہ جواب دیتا ہے۔

> ''یہ ہم سے نفرت کرتے ہیں۔۔۔ نہیں ایسا ہرگز نہیں ہے انھیں اپنے آپ سے محبت ہے۔۔۔''[۱۷]

افسانے کا انجام گویا بلوچستان کے اصل مسئلے کی طرف اِشارہ کرتا ہے۔ وہاں کے باشندوں کو محروم رکھا گیا نتیجتاً وہ تشدد کی راہ پر گامزن ہو گئے تو اُن کے مسائل کو حل کرنے کی بجائے اُن کے ساتھ ایک بے مقصد جنگ لڑی جانے لگی۔

یہ افسانہ بلوچستان کے زمینی حالات و کوائف صحرائی زندگی اور سیاسی مسئلے کو بڑی جامعیت، دلچسپ اور پُر تاثیر پیرائے میں بیان کرتا ہے۔ اس مسئلے سے الگ بھی افسانہ اعلیٰ جہات اور معیار کا حامل ہے۔

مجموعی طور پر بلوچستان میں لکھا جانے والا اُردو افسانہ وہاں کی مٹی اور سرزمین سے جڑا ہوا ہے۔ انگریز کے خلاف مزاحمت سے لے کر موجودہ عہد کی ناانصافیوں تک ہر دور کے سماجی و سیاسی شعور کا حامل رہا ہے۔ فنی و اسلوبیاتی حوالے سے بیانیہ اور علامتی تکنیک کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے یہاں انگریزی افسانوں کے تراجم بہت کیے گئے اور ان کی تکنیک اور بنت سے افسانہ نگار متاثر بھی ہوئے۔ مقامی مسائل کو جدید تکنیک میں مؤثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

حواشی:

۱۔ خدابخش میر بجرانی مری جسٹس سعید احمد رفیق، پروفیسر، Search Light on Baluches & Baluchistan، بلوچستان تاریخ کے آئینے میں، کوئٹہ: نساء ٹریڈرز،۱۹۸۴ء،ص: ۲۲

۲۔ شاہ محمد مری، بلوچی کہانی کا عروج و زوال، الحمرا انٹرنیشنل کانفرنس، اکتوبر ۲۰۱۲ء میں پڑھا گیا

۳۔ مبارکہ حمید، ڈاکٹر، بلوچستان میں اُردو افسانے کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، کوئٹہ: نوید پبلی کیشنز،۲۰۰۱ء،ص: ۳۳

۴۔ عنایت اللہ خان، طاہر محمد خان کے افسانے، (دیباچہ)، مشمولہ: زود پشیماں، مرتبہ: طاہر محمد خاں، کوئٹہ: قلات پبلشرز، ۲۰۰۴ء،ص: ۷

۵۔ فاروق احمد، ڈاکٹر، سچا اظہار، ایضاً،ص: ۱۲

۶۔ طاہر محمد خان، زود پشیماں، ایضاً،ص: ۳۱

۷۔ طاہرہ محمد خان، پانی کا جبر، ایضاً،ص: ۴۳

۸۔ وحید زہیر، ماسک سے محروم دانشور،ص: ۱۸

۹۔ فاروق سرور، بھیڑیا، ندی کی پیاس، کوئٹہ: تھرڈ ورتھ پبلی کیشنز،۱۹۹۴ء،ص: ۴۲

۱۰۔ سہراب اسلم، آغا گل کے افسانوی مجموعے گوریجہ پر ایک نظر، مشمولہ: قلم قبیلہ، سہ ماہی، (مدیر: ثاقبہ رحیم الدین)، کوئٹہ، بلوچستان: جنوری تا جولائی ۱۹۹۴ء،ص: ۲۳۲

۱۱۔ آغا گل، اُستاد مہر، مہر گڑھ، کوئٹہ: دُعائے حق پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء،ص: ۷۳

۱۲۔ ایضاً، ہابیل قابیل،ص: ۸۳

۱۳۔ آغا گل، پرندہ، کوئٹہ: انسٹی ٹیوٹ آف ریسرچ اینڈ پبلی کیشنز،۲۰۱۲ء،ص: ۷۴۔۷۳

۱۴۔ آغا گل، دشتِ وفا کے بارے میں آغا گل نمبر، مشمولہ: روشناس۔۶، (مدیر: محمد مصلح الدین)، کراچی: نومبر ۲۰۱۱ء،ص: ۱۱

۱۵۔ یعقوب شاہ غرشین، بوئے خون ریش، بازگیر، کوئٹہ: قلات پبلشرز،۲۰۰۴ء،ص: ۵۲۔۵۱

۱۶۔ محمد حمید شاہد، برشور، مشمولہ: محمد حمید شاہد کے پچاس افسانے، مرتبہ: ڈاکٹر توصیف تبسم، اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۰۹ء،ص: ۷۸۔۷۷

۱۷۔ خالد فتح محمد، صحرا کا پھول، مشمولہ: مزاحمتی ادب، (۲۰۰۷ء۔۱۹۹۹ء)، اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۹ء،ص

☆☆☆